Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور

Year 2025; Vol 04 (Issue 02)
P. 50-64 https://journals.gscwu.edu.pk/

ڈاکٹر روبینہ شاہین

پی ایچ ڈی، اردو

Dr. Rubina Shaheen

Ph.D. Urdu

صفیہ اختر کا تانیثی شعور ("حرفِ آشنا" اور "زیرِ لب" کے تناظر میں)

Safia Akhtar's Feminism (In the Context of "Harf-e-Ashna" and "Zair-e-Lab")

Abstract:

Safia Akhtar is the wife of the renowned Urdu poet, Jan Nisar Akhtar. She is a modern Indian woman with progressive and feminist consciousness. This thought is clearly expressed in the collections her letters, "Harf-e-Ashna" and "Zair-e-Lab," which she wrote to her husband. In these letters, we see a new woman of the twentieth century who dares to move forward with the support of her self-confidence. She rejects the unnecessary restrictions imposed by society and breaks the iron chains of age-old and outdated traditions. She knows how to protect her rights. In her feminist consciousness, we see a balance, softness, and harmony with nature. She neither shouts slogans to abolish the concept of gender from society nor demands the rejection of the distinctions of the natural and social positions of men and women. She does not demand that women be treated like men, but rather that she wishes to be given all rights on an equal footing, recognizing and understanding the natural differences between men and women. In her letters, we see a practical picture of a feminist woman who is a follower of "New Age Feminism".

Keywords: "Harf-e-Ashna", "Zair-e-Lab", progressive thoughts, feminist consciousness, gender differences, equal rights, "New Age Feminism".

تانیثیت(Feminism) کی بات کریں تو مختلف النوع آوازیں سماعت سے ٹکراتی ہیں اور متضاد آرا فکر کو گراں بار کرتی ہیں۔ ہر فرد اپنی ذہنی اُپج کے مطابق اس کے معانی و مفہوم اور دائرۂ کار کا گھیراؤ کرتا ہے اور اپنے اعمال و تجربات میں اس کا اظہار کرتا ہے۔ ادب کی تانیثی تنقید کے مطالعہ کے دوران بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے۔ ہر نقاد اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تخلیق اور تخلیق کار کے تانیثی شعور کی تلاش کرتا ہے اور اسے اپنی فکر کے جامے میں ملبوس کر کے پیش کرتا ہے ۔اس کی بڑی وجہ خود تانیثیت کا تصور ہے جو اپنے نقطہء آغاز سے لے کر تاحال نہ صرف تغیر و تبدل کے مختلف ادوار سے گزرتا رہا ہے بلکہ اس کی شدت بھی مد و جذر کی کیفیات کا شکار رہی ہے۔ بنابریں تانیثیت کی جو گوناگوں اشکال سامنے آئی ہیں ان کے پیشِ نظر تخلیق کار کا تانیثی شعور آئینہ بدل جانے پر ایک متغیر چہرے کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

ادب کی کسی بھی صنف کا تانیثی تنقید کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے تو بلاشبہ وہ اپنے لکھنے والے کے تانیثی شعور کی واضح طور پر عکاسی کرتا ہے۔ تاہم خطوط کا تانیثی مطالعہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے تانیثی شعور کی پرتیں جس گہرائی سے کھولتا ہے وہ کسی اور صنف کے ذریعے ممکن نہیں۔ نجی اور ذاتی ہونے کی بنا پر خط میں لکھنے والا ہر قسم کی باتیں لکھ دیتا ہے اور خصوصاً اس صورت میں جب مکتوب الیہ کے ساتھ محبت اور اعتماد کا رشتہ قائم ہو تو پھر راز و نیاز کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور عادات واطوار، فکر و افکار اور تصورات و نظریات سب ایک دوسرے پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ صفیہ اختر کے "زیرِ لب" اور "حرفِ آشنا" کے خطوط کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے ۔ان خطوط کے مکتوب الیہ چوں کہ صفیہ کے عزیز از جان شوہر نامدار ہیں لہٰذا انہوں نے الفاظ کی صورت میں اپنی فکر و نظر اور دل و دماغ کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

تانیثیت کی بنیادی فکر یعنی حقوقِ نسواں ، تعلیمِ نسواں اور آزادی نسواں کے نقطہء نظر سے دیکھا جائے تو صفیہ کا گھرانہ اس دور میں جب کہ ابھی اس تحریک کا آغاز ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، تانیثیت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتا ہے ۔صفیہ کے والد صاحب تعلیم یافتہ تھے اور حقوقِ نسواں کے پاسدار۔ والدہ صاحبہ ان پڑھ تھیں مگر زمانہ ساز، ذی شعور اور دنیاداری کے مسائل سے نپٹنے کا پورا سلیقہ رکھتی تھیں۔ گھر کے اندر اور باہر کے مسائل نیز زمینداری کے پیچ و خم سے الجھنا اور انہیں سلجھانا ان ہی کے سپرد تھا۔ صفیہ کے والد بیوی کی رائے کو قبول کرنے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے تھے۔ اپنی محنت کی کمائی لا کر ان کے حوالے کر دیتے تھے ۔یوں صفیہ کی والدہ کو گھر کی سلطنت کے تمام اختیارات حاصل تھے ۔والدین کی شخصیتوں میں تضاد کے باوجود ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ دونوں اعلیٰ تہذیبی اقدار کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ بدلتے وقت کے تقاضوں کو بھی سمجھتے تھے اور تعلیمِ نسواں اور آزادی نسواں کے حامل تھے لہٰذا بیٹوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ صفیہ کے دونوں بھائی فقط روشن خیال اور ترقی پسند فکر کے حامل ہی نہیں بل کہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ تھے۔ اسرار الحق مجاز کی ترقی پسندی اور ترقی پسند شاعری کی ہندوستان بھر میں دھوم تھی۔ انصار الحق ہروانی تحریکِ نسواں میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے شیخ عبد اللہ کی سنگت میں تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں پوری یوپی کا دورہ

کیا۔ ایسے ترقی پسند ماحول میں صفیہ کی پرورش ہوئی اور انہیں اپنے گھر اور افرادِ خانہ کی طرف سے ان مسائل سے واسطہ نہیں پڑا جو اس دور کے عام غیر تعلیم یافتہ گھرانوں کی لڑکیوں کو درپیش تھے۔ گھر کے پڑھے لکھے ماحول نے صفیہ کو پر اعتماد، باحوصلہ، جرات مند اور صاحب رائے شخصیت کے روپ میں ڈھال دیا۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم اور اعلیٰ بی (بیگم شیخ عبد اللہ) کی تربیت سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی اور صفیہ ایک "نئی عورت" کے روپ میں سامنے آئیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں علی گڑھ مسلم کالج میں لیڈی سپروائزر کی ملازمت مل گئی تو وہ مردوں کے سہارے سے بے نیاز ہو کر اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئیں۔ تعلیمِ نسواں کی شرط تو پوری ہوئی ہی تھی ملازمت نے صحیح معنوں میں آزادی نسواں کی ضمانت بھی دے دی۔ تاہم یہ اس وقت کی بات ہے جب فیمینسٹ کے لفظ نے رواج نہیں پایا تھا اور نہ ہی تانیثیت (Feminism) کی تحریک نے نعروں اور جلوسوں کی شکل اختیار کی تھی۔ تاہم تحریکِ آزادی اور کمیونسٹ پارٹی میں سروجنی نائڈو، مسز ارونا آصف اور ہاجرہ جیسی جرات مند اور بے باک خواتین مردوں کے دوش بدوش آزادی کے لیے برسرِپیکار تھیں مگر یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ہندوستان کا طبقۂ نسواں ہنوز اپنے حقوق و فرائض سے بے خبر تھا۔ اس بے خبری اور جہالت کے دور میں ہمیں صفیہ اختر اور ان کے بہن بھائی فیمینزم کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ صفیہ اور ان کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم کی فکر پر ان کے بھائی اسرار الحق مجاز کے ترقی پسند نظریات کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ اس ضمن میں حمیدہ سالم رقم طراز ہیں:

"سماج میں عورت کا درجہ ابھارنے کے لیے سوچ کے ان طریقوں کی ضرورت ہے جو مسئلہ کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ عورت کے لیے اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق سے واقفیت ضروری ہے اور حقوق حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے میں اعتماد و حوصلہ کی ضرورت ہے اور یہ حوصلہ و اعتماد پیدا ہوتا ہے اس تعلیم سے جو ضرورت پڑنے پر اس میں اپنی کفالت کی سکت پیدا کر سکے۔ ہم بہنوں پر اپنے بھائی کی نظم "نوجوان خاتون سے خطاب" کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ نہ ہی تو بے حس تھے نہ ہی کند ذہن جوان اشعار سے متاثر نہ ہوتے۔

تیرے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
میرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
اس آنچل سے تو ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا۔"[1]

صفیہ میں سماج کی عائد کردہ بے جا پابندیوں کو ٹھکرانے، گھسی پٹی روایات کو توڑنے اور اپنے حق کی خاطر آواز اٹھانے کا حوصلہ تھا۔ اس وقت کے پدر شاہی معاشرے میں لڑکیوں کی حیثیت بے زبان جانور سے زیادہ نہیں تھی۔ کسی لڑکی کا اپنے حق

کی خاطر آواز اٹھانا تو در کنار اپنی جائز خواہشات کا دبی زبان سے اظہار بھی ممنوع تھا۔ صنفِ نازک کو ہر روپ میں مرد کی خدمت گار اور ایک کم تر ہستی تصوّر کیا جاتا تھا۔ بیٹی باپ کے لیے ایک ایسا ناگوار بوجھ ہوتی تھی جس سے وہ جلد از جلد چھٹکارا پانے کے لیے اپنی عمر کے مرد کے کھونٹے سے باندھنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ شوہر کے لیے بیوی کی اہمیت پاؤں کی جوتی سے زیادہ نہ تھی۔ عورت مرد کی کفالت میں ہونے کے باعث اس کی بے دام کنیز اور ہر طرح کا ظلم سہنے کے باوجود مرد کی محبت اور وفا کا دم بھرنے پر ہمہ وقت دل و جان سے آمادہ تھی۔ ایسے ماحول میں ایک جوان لڑکی کا اپنے جوان بھائی سے جنس کے موضوع پر بات چیت کرنا قدیم روایات کی بنیادیں ہلا دینے کے مترادف تھا۔ صفیہ اختر نے یہ معرکہ بھی سر کیا۔ جب ان کے لیے جاں نثار اختر نے اپنی والدہ کے ذریعے شادی کا پیغام بھجوایا تو صفیہ کے بڑے بھائی انصار الحق ہروانی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث جیل میں تھے، صفیہ نے انہیں خود خط لکھ کر جاں نثار سے اپنی شادی کے سلسلے میں مشاورت طلب کی۔ حمیدہ سالم اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ”ہمارے جیسے ماحول کی پڑھی ہوئی ایک جوان لڑکی اپنے جوان بھائی سے کھل کر سیکس کے موضوع پر بات کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے شادی ہر لڑکے لڑکی کی فطری ضرورت ہے لیکن اس ضرورت کے باوجود ان کی نظر میں جنسی تقاضوں کی ثانوی اہمیت ہے۔ یہ ہیں ان کے اس خط کے جملے جو انہوں نے انصار بھائی کو جیل میں لکھ کر بھیجا تھا اور بھائی اختر کے ساتھ اپنے رشتہ کے سلسلہ میں مشورہ لیا تھا۔“(2)

انصار الحق ہروانی سے مشاورت طلب کرنے کے علاوہ صفیہ نے اپنے بڑے بھائی اسرار الحق مجاز (جو زمانہ طالب علمی سے نہ صرف جاں نثار کو جانتے تھے بلکہ گہری دوستی ہونے کی بنا پر ان کی شخصیت کے ظاہر و باطن سے بھی خوب واقف تھے) سے جاں نثار کے لیے اپنی دلی خواہش اور پسند کا اظہار کیا اور بھائیوں نے بھی ان کی خواہش کا احترام کر کے روشن خیالی کا ثبوت دیا۔ ان کا یہ اقدام ان کے تانیثی شعور کا غماز ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورت سے متعلق تمام فیصلے کرنے کا کلی اختیار ہر روپ میں مرد کو حاصل ہو اور عورت ایک بے زبان گائے کی مانند زندگی بسر کر رہی ہو، ایک متوسط طبقے کی لڑکی کا اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ خود کرنا تانیثیت کی دلیل ہے۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آنے والے دنوں میں صفیہ نے قدم قدم پر انتہائی جرات اور حوصلہ مندی سے تمام معاملاتِ زندگی کو سنوارا۔

جاں نثار اختر کی طرف سے رشتہ بھیجنے کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی تو اپنے والدین کی تشویش اور اذیت کو دیکھتے ہوئے صفیہ نے ایک بار پھر قدیم روایات کی زنجیروں کو توڑا۔ پہلے تو انہوں نے اسرار بھائی سے جاں نثار سے وجۂ تاخیر معلوم کرنے کے لیے اصرار کیا مگر بھائی کی جھجھک اور خاموشی دیکھ کر خود اپنے حق کے لیے آواز بلند کی اور شادی کی تاریخ مقرر کرنے میں تاخیر کی وجہ جاننے کے لیے جاں نثار کو خود خط لکھنے کی جسارت کی:

”آپ کو یہ اجنبی تحریر دیکھ کر حیرت ہو گی اور واقفیت حاصل ہونے پر کیا احساس پیدا ہو اس کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ بہر حال فعل اپنی جگہ جسارت آمیز ضرور ہے، اس سے مجھے خود انکار نہیں گو کہ عملی روشنی میں اسے ایسی بڑی اہمیت حاصل نہ ہونی چاہیے، مگر رواج اور روایات کو شاید لرزہ ہی آجائے میرا یہ اقدام دیکھ کر، مگر کیا کروں کہ اکثر اپنے کو وہاں پاتی ہوں، جہاں پگھلی ہوئی زنجیر آئینِ قدامت کی،۔۔۔ آخرش عورت بھی کسی قسم کی قوتِ احساس و تمیز رکھتی ہے، اسے آپ لوگ اکثر بھول جاتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس تحریر کو آپ کس قدر اہمیت دیں گے لیکن کم سے کم یہ توقع ضرور ہے کہ بے جا رسوائی نہ کیجئے گا۔“(3)

مذکورہ بالا سطور میں صفیہ کی صورت میں ہمیں بیسویں صدی کی نئی عورت دکھائی دیتی ہے جو کہن سالہ اور فرسودہ روایات کی آہنی زنجیروں کو توڑ کر اپنی خود اعتمادی کے سہارے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ جو اپنے حقوق کی حفاظت کرنا خوب جانتی ہے اور اگر اس کی عزتِ نفس اور خودداری کو چوٹ پہنچے تو وہ معاشرے کے ٹھیکے داروں سے جواب طلب کرنے کی جرات رکھتی ہے۔ صفیہ میں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور وہ اپنی پسند و ناپسند کو دوسروں پر واضح کرنے کی جرات رکھتی ہیں۔ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا عزم رکھتی ہیں اور راستے میں پیش آنے والی تمام رکاوٹوں کو عبور کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ صفیہ 12 جنوری 1951ء کے خط میں خود رقم طراز ہیں:

”میں اپنی خواہش، اپنی پسند اور اپنے ارادے سے تم سے منسوب ہوئی۔ میری ایک ”نہیں“ بھی اس سلسلے کو ختم کر سکتی تھی۔ پھر تمہاری ہچکچاہٹ اور تمہاے تذبذب پر تمہارے قدم میں استقلال پیدا کرنے میں میرا حصہ رہا۔ اگر میں اپنے شوقِ فضول و جراتِ رندانہ کو استعمال کر کے تمہیں خط لکھنے میں خود اقدام نہ کرتی تو نہ جانے ہماری زندگیاں آج کہاں بھٹک رہی ہوتیں۔“(4)

صفیہ اپنے موقف کے حصول کے لیے بلند آہنگ نعرے لگانے کی قائل نہیں ہیں اور نہ ہی اپنے حق کے استعمال اور اس کے حصول کے لیے اس شدت پسندی کی قائل ہیں جو تانیثیت کی تحریک کے پہلے دور کی پیداوار ہے۔ ان کے انداز و اطوار سلیقہ، توازن اور ملائمت کے حامل ہیں۔ وہ عورت کو استحصال سے بچانا تو چاہتی ہیں مگر مرد کے حقوق کو بھی تسلیم کرتی ہیں۔ وہ میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں خوب صورت ہم آہنگی، دوستی اور برابری کی خواہاں ہیں۔ صفیہ 19 اکتوبر 1943ء کے خط میں جاں نثار کو لکھتی ہیں:

”شوہر کا تصّور اب میرے لیے ایک دیوتا کا تصّور نہیں، ایک دوست کا تصّور ہے لیکن ایک ایسے

> دوست کا تصوّر جو مجھ سے بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتا ہو، خیالات میں، ارادوں میں، عمل میں اور پھر اس فوقیت کو تسلیم کرنے میں مجھے ایک ابدی سکون حاصل ہوتا ہے، شاید یہ جذبہ تعظیم ہی عورت کی فطری کمزوری ہے جس سے مرد ہمیشہ فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ اپنی ذہنی پختگی کے باوجود مجھے اپنی یہ نسائی کمزوری حسین نظر آتی ہے۔ یہی تصوّر تھا جس نے اب تک مجھے اپنی روح کے فروخت کرنے سے باز رکھا، ورنہ شاید اس زندگی کے نرم گرم سہنے کی نوبت آچکی ہوتی۔"[5]

صفیہ کے خط کے اس اقتباس کو پڑھنے سے جو پہلا تاثر ذہن میں ابھرتا ہے وہ بظاہر انہیں ایک ایسی روایتی عورت کے روپ میں پیش کرتا ہے جو پدر شاہی معاشرے کی پیداوار ہے اور مرد کی بالا دستی اور حاکمیت کو تسلیم کرتی ہے۔ اسے بہت سی خصوصیات میں عورت سے بہتر خیال کرتی ہے اور عورت کو مرد سے کم تر خیال کرتی ہے۔ صفیہ کے نزدیک عورت کی کمتری اور کمزوری اس کی خامی نہیں بلکہ مردانگی کے حوالے سے عورت کی یہ "نسائی کمزوری" اس کے حسن کا ایک پہلو ہے، ایک ایسا خوب صورت اور دل نواز پہلو جو عورت کی جسمانی وروحانی پاکیزگی کو بالیدہ رکھتا ہے تاہم ان کی یہ منطق فیمینزم کے پہلے دور کے تقاضوں کو رد کرتی ہے اور انہیں ایک اینٹی فیمینسٹ خاتون کے طور پر پیش کرتی ہے۔ یہاں صفیہ ہمیں اینی کوڈٹ (Anne Koedt)، ایلس ایکولس (Alice Echols)، میری ڈیلی (Mary Daly) وغیرہ کی ریڈیکل فیمینزم تھیوری کی مخالفت کرتی نظر آتی ہیں جو معاشرے سے صنف (Gender) کے تصوّر کو بالکل ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ وہ عورتوں اور مردوں کے حیاتیاتی فرق کو تسلیم نہیں کرتیں اور ان کے سماجی مناصب کی تقسیم سے انحراف کرتی ہیں کہ مرد کمائے، معاشی و سماجی ترقی کی منازل طے کرتا رہے اور عورت گھر پر رہ کر بچوں کی افزائش و پرورش اور گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھالے اور معاشی ترقی کی دوڑ میں اس کا کردار صفر ہو جائے۔ وہ ایسے پدر شاہی نظام کو ختم کر دینا چاہتی ہیں اور معاشرے کو مکمل طور پر متغیر کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ خود تخلیق کے کرب سے گزرنا پسند نہیں کرتیں بلکہ ایسی ٹیکنالوجی کو پسند کرتی ہیں جس کی بدولت بچے کی افزائش و پیدائش عورت کے وجود کی محتاج نہ رہے تاکہ عورت اپنا وقت اس کام میں برباد کرنے کی بجائے اپنے مستقبل کو سنوارنے پر صرف کرے اور معاشی ترقی میں مرد کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے اور کسی طور اس سے پیچھے نہ رہے۔

اگر ہم مرد وزن کے نقطہ آغاز، ان کی جسمانی ساخت، ان کی قابلیت، صلاحیت اور قوت وغیرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تمام پہلوؤں سے اس نظریہ کی پرکھ کریں تو یہ شدت پسندی پر منتج ہوتا ہے اور اس کی پیروکار خواتین کے شدت پسندی پر مبنی تقاضے نہ صرف معاشرے بلکہ ان کی اپنی بقا کے لیے بھی خطرے کا نشان ثابت ہو سکتے ہیں کیوں کہ انسان جب بھی فطرت اور اس کے قوانین سے ٹکرانے کی کوشش کرے گا وہ پاش پاش ہو جائے گا۔ جس معاشرے کے خواب یہ عورتیں دیکھ رہی ہیں اس کی تعبیر پانے کے لیے انہیں اپنی تمام تر بائی آلوجی کو مکمل طور پر بدلنا ہو گا تب ہی وہ اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنا سکیں گی اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ عورت مرد کے برابر حقوق کا مطالبہ تو کر سکتی ہیں لیکن کلیتاً مرد نہیں بن سکتی۔ وہ لاکھ ذہین و

فطین ہو، طاقت اور قوت رکھتی ہو، ذی شعور و ذی عقل ہو، علوم وفنون کی ماہر ہو مگر وہ اپنے فطری مناسب وظائف سے انحراف نہیں کر سکتی۔ مرد وزن دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی تمام وظائف ادا کرنے ہوں گے۔ ہم کتنے ہی نظریات و قوانین بنالیں، کیسے ہی بلند وبانگ دعوے کرلیں اور فلک شگاف نعرے لگالیں قدرت کی تقسیم کار کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیکل فیمینزم کی تھیوری اپنی ابتدائی شکل وصورت کے ساتھ زیادہ عرصہ چل نہ سکی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تغیر و تبدل اور وسعت پیدا ہوئی اور یہ بتدریج فطرت سے ہم آہنگ ہوتی گئی۔

متذکرہ بالا نکات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اگر صفیہ کے تانیثی شعور کا جائزہ لیں تو اس میں ہمیں ایک توازن، ملائمت اور فطرت سے ہم آہنگی نظر آتی ہے اور ان کی "نسائی کمزوری" نسوانی حسن میں اور "جذبہ تعظیم" نسوانی وقار میں ڈھل جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صفیہ مرد کو مطلق العنانی کا تاج پہنا رہی ہیں اور عورت کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں بلکہ صفیہ مرد اور عورت دونوں کے حقوق میں مساوات کی قائل ہیں۔ ان کے جاں نثار کے نام 19 اکتوبر 1943ء کو لکھے گئے خط کا ایک اقتباس دیکھیے:

> "مجھے شادی شدہ زندگی کا کریہہ ترین پہلو ہمیشہ پچھلے وقتوں میں شوہروں کا ذوقِ ملکیت اور
> موجودہ تہذیب میں بیویوں کا شوہروں پر پہرہ ہی محسوس ہوتا رہا ہے۔ اور اپنے تصّورات میں
> میرا تہیہ یہی رہا ہے کہ مجھے اس غیر فطری کمینگی سے بالاتر ہونا چاہیے۔"(6)

صفیہ نے فقط دو جملوں میں تانیثیت کی حقیقی روح کو سمو دیا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب تانیثیت کی تحریک شدت پسندی کی شاہراہ پر گامزن تھی۔ وہ انتہائی سلیقے اور توازن سے میاں بیوی کے روایتی رشتے کے خلاف آواز بلند کر رہی ہیں جس میں مرد کی حیثیت حاکم کی اور بیوی کی حیثیت محکوم کی ہوتی تھی اور عورت کو جذبات واحساسات سے عاری مخلوق تصّور کیا جاتا تھا۔ مرد ہمیشہ اس پر اپنی مرضی ٹھونستا تھا اور قدم قدم پر اس کے دل کے کنول کو اپنے قدموں تلے روندتا اور اس کے فطری تقاضوں اور خواہشات کو تاراج کرنا اپنی مردانگی کی شان سمجھتا تھا۔ صفیہ مردوں کے اس تصّورِ حاکمیت کو انسانی زندگی کا بدصورت ترین اور نفرت انگیز پہلو قرار دیتی ہیں لیکن وہ ریڈیکل فیمینسٹ خاتون کی مانند اپنے حقوق کے حصول کی خاطر مرد کے وجود کی نفی نہیں کرتیں بلکہ اس کے وجود کی فطری اہمیت کو تسلیم کرتی ہیں۔ اگر ایک طرف وہ عورت کے لیے برابر کے حقوق کی داعی ہیں تو دوسری طرف مرد کے لیے بھی برابر کے حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اگر وہ عورت پر لگائی جانے والی ناروا پابندیوں کے خلاف ہیں تو ان پہروں کو بھی ناپسند کرتی ہیں جو بیویاں اپنے شوہروں پر لگاتی ہیں اور یہ خیال کرتی ہیں کہ مرد کی محبت اور وفا کو فتح کرلیا ہے۔ صفیہ اسے "غیر فطری کمینگی" قرار دیتی ہیں۔ وہ صرف زبانی کلامی طور پر ہی فیمینزم کی حامی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ان کی تمام زندگی تانیثیت کی عملی تفسیر ہے۔ انہوں نے جاں نثار کے عقیدت مندوں اور دوستوں کو وسعتِ دل سے قبول ہی نہیں کیا بلکہ ایسی توجہ دی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

فاطمہ زبیر (جاں نثار کی عقیدت مند) اور انجم (جاں نثار کی منہ بولی بہن) سے صفیہ کی محبتیں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کے نزدیک میاں بیوی کا رشتہ ان مٹ دوستی پر مبنی ہونا چاہیے۔ وہ شوہر کو ایک دوست کے روپ میں دیکھتی ہیں اور ان سے وہی تو

قعات وابستہ رکھتی ہیں جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے ہو سکتی ہیں: " دوستی کا رشتہ ہمیشہ مضبوط تر ہونا چاہیے، یہی میری خواہش ہے۔" (7)

وہ جسمانی قرب کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کی ذہنی رفاقت اور ذہنی ہم آہنگی کو مرد وزن کے باہمی تعلقات کی خوب صورتی اور مضبوطی کے لیے ایک اہم بنیاد قرار دیتی ہیں۔ صفیہ کے 12 جون 1950ء کے خط بنام جاں نثار اختر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> " ہم دونوں کی صحبتیں کتنی رنگین، کتنی بھرپور، اور کیسی دلچسپ ہوتی ہیں اختر۔ ہم نے دوستی کا لطف ایک دوسرے سے بہت پایا ہے۔ میں نے زندگی میں تم سے دوستی، رفاقت، سرپرستی، شفقت، ملائمت سبھی چیزیں پائیں۔ تمہیں پا کر مجھے زندگی میں کسی کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ کتنی بھٹکی ہوئی زندگی، کتنے متلاشی جذبات کو پناہ مل گئی اختر! تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔ زندگی ہی کے برابر! تم سے ہی جینا ہے اور تمہیں سے مرنا۔ کتنی واقعیت ہے ہمارے ساتھ میں اور ساتھ ہی کتنا رومان! تمہارے تصوّر ہی سے اکثر میں کتنی جذباتی ہو جاتی ہوں اور تمہاری تکلیف کے خیال سے یہاں رہ کر بھی کتنے آنسو بہا لیتی ہوں۔" (8)

صفیہ کے لیے شوہر کے روپ میں مرد کا وجود زندگی میں دل کشی، رعنائی، لطف و کرم اور کیف و سرور کا باعث ہے۔ وہ شوہر کو ایک دوست کا درجہ دے کر میاں بیوی کی باہمی توقعات کو برابری کی سطح پر لا کر پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہوا دیکھتی ہیں تو دراصل وہ انتہائی خوب صورت اور دل نشیں الفاظ میں عورت کے لیے برابر کے حقوق کا تقاضا کرتی ہیں اور جب وہ شوہر کی سرپرستی اور شفقت پانے پر مسرت کا اظہار کرتی ہیں تو گویا وہ عورت کی فطری نسوانیت اور مرد کی فطری بالادستی کا اقرار کرتی ہیں مگر اگلے ہی لمحے وہ اس بالادستی کو "ملائمت" کے ساتھ مشروط کر کے الفتوں اور رفاقتوں کو باہمی تسلیم و رضا کے دائرے میں محصور کر دیتی ہیں اور اپنے مخصوص نرم اور متوازن لہجے میں جنسی استحصال کی مذمت کرتی ہیں۔ صفیہ بھرپور اور پر مسرت زندگی گزارنے کے لیے مرد وزن دونوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ کو ناگزیر خیال کرتی ہیں مگر ایسا ساتھ جس میں دونوں کے دکھ سکھ، راحت و کلفت، مسکراہٹیں اور اشک ساجھے ہوں۔ اگر عورت مرد کی خوشی اور راحت کو اپنا مقصدِ حیات بنائے تو مرد کو بھی برابر اس کی مسّرت اور سکون کا خیال ہونا چاہیے:

> "میرے دوست ساری مسّرتیں، میری تمام راحتیں صرف تمہارے دم سے وابستہ ہیں۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا کرو اپنی خاطر نہیں بلکہ میری خوشی کی خاطر کیا کرو۔" (9)

صفیہ تعلیم یافتہ، روشن خیال، اشتراکیت اور آزادی نسواں کی حامی ہونے کے باوجود نہ تو مردوں سے نفرت کرتی ہیں اور نہ ہی ان کی فطری بالادستی کو رد کرتی ہیں بلکہ روایتی ہندوستانی عورت کی طرح ان کے تحت الشعور میں یہ بات رہتی ہے کہ

ان کا جنازہ شوہر کے کندھوں پر اٹھے، وہ سہاگن ہی اس دنیا سے رخصت ہوں۔ اپنی دوست سعیدہ کے شوہر کی اچانک وفات پر جاں نثار کو 15 فروری 1951ء کے خط میں لکھتی ہیں:

" اس خبر سے دل پر بری طرح چوٹ لگی۔ خدا مجھے تمہارے سامنے ہی اس دنیا سے اٹھالے۔
طبعیت اس خبر سے بری طرح خوف کھا گئی ہے۔" (10)

بظاہر صفیہ اپنے خطوط میں ہمیں ایک روایتی ہندوستانی بیوی کے روپ میں نظر آتی ہے جس کا تانیثیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ تاہم بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منفرد تانیثی شعور رکھتی ہیں جو عورت کو نئی سوچ تو دیتا ہے مگر اعلیٰ تہذیبی اقدار سے جدا نہیں کرتا بلکہ ثقافت سے جوڑے رکھتا ہے۔ عام تعلیم یافتہ خاتون کی طرح ان کی سوچ کا محور صرف اپنی ذات نہیں بلکہ ان کا گھر، ان کا شوہر اور ان کے بچے ان کی محبتوں کا مرکز ہیں۔ ان کی ملازمت، ان کا مستقبل اور سماجی ترقی ان کے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث ضرور ہے مگر ان کی ازدواجی زندگی اور بچے ان کے کیریئر سے کہیں زیادہ ان کی مسرت اور راحت کا سبب ہیں۔ صفیہ 20 جولائی 1950ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

"میں بری ماں ثابت نہیں ہوئی اور وقت پڑنے پر میں نے باپ کے فرائض بھی ان کے لیے پورے کیے ہیں اب جب کہ تم اس طرح ایک پریشان کن اور متزلزل حالت میں بمبئی کی اذیت بھری زندگی گزار رہے ہو۔ دونوں کو تمہارے سر پٹک کر اپنا Career بنانے امریکہ چل پڑوں یہ عملاً کہاں درست ہوگا اور کہاں تک ممکن۔ میں اپنی ذاتی ترقی اور ناموری کی خاطر تمہارا ساتھ چھوڑ کر اور بچوں کو محروم کر کے کیسے جاسکوں گی؟ --- آج تم نے یہ کیسا مطالبہ کیا میرے ساجن --- اب میرے لیے کوئی بڑائی تم سے الگ ہو کر منتظر نہیں ہو سکتی۔ میں اگر ملازمت کر رہی ہوں تو کسی اعزاز کی خاطر نہیں، اپنی شخصیت کا وقار بڑھانے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے اور تمہارے حالات کو آسان بنانے کے لیے۔ آج تمہارے حالات ہموار ہو جائیں تو میں ملازمت چھوڑ چھاڑ کر پوری طرح خود کو تمہاری خدمت کے لیے وقف کر دوں۔" (11)

صفیہ اپنا مستقبل سنوارنے اور ترقی کرنے کی خاطر شوہر کی راحت اور بچوں کا مستقبل داؤ پر نہیں لگانا چاہتیں۔ وہ ایسے تانیثی شعور کی پیروکار نہیں بننا چاہتیں جو سماجی ترقی کی خاطر مرد کے وجود کا انکار کرے اور اس کی محبت کو ٹھکرا کر اپنی مادی ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں جو بچوں کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتے ہوئے بچے پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ وہ مرد اور عورت کے فطری امتیازات اور فطری مناصب کو پہچانتی اور سمجھتی ہیں اور فطری مناصب کی ادائیگی کو اپنے کیریئر پر اوّلیت دیتی ہیں۔ وہ تانیثیت کے نام پر اپنی نسوانیت کا سودا نہیں کرتیں اور نہ ہی ایسی برابری کا تقاضا کرتی ہیں جس میں مقابلہ بازی کا رجحان پایا جائے۔ ایک روشن خیال عورت کے طور پر ان کی نظر میں معاشی استحکام اور معاشی آزادی کی

اہمیت ضرور ہے لیکن ذاتی مفاد اور خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ اپنے اور خاندان کے حالات میں بہتری لانے کے لیے۔

صفیہ جدوجہدِ حیات میں ہمیشہ جاں نثار اختر کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہیں اور ہر گرم سرد کا مقابلہ جواں مردی سے کرتی ہیں۔ علی گڑھ میں تنہا رہ کر ملازمت جاری رکھنا، بچوں کی پرورش کی تمام ذمہ داری نبھانا اور گوالیار میں موجود شوہر کی تمام ضروریات کا خیال رکھنا، ان تمام ذمہ داریوں کو وہ بطریقِ احسن نبھاتی رہی ہیں۔ تحریکِ آزادی کے شعلوں نے جب گوالیار کو لپیٹ میں لیا اور جاں نثار لگی لگائی روزی چھوڑ کر بھوپال جانے پر مجبور ہوئے تو صفیہ نے ثابت قدمی اور جرات مندی کا ثبوت دیا اور ان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو گئیں۔ بے روزگار اور پریشان حال شوہر کی ہر طرح سے دل جوئی کی اور ہمت بندھاتی رہیں اور انہیں معاشی سہارا بھی فراہم کیا:

> ” دراصل میرا خیال اور عقیدہ یہی ہے کہ تمہارے قدم اکھڑ جانے کے بعد مجھے آخری دم
> تک محنت کرنا اور کچھ حاصل کرتے رہنا چاہیے ورنہ یہ کشتی کیوں کر پار ہو گی۔“ (12)

جاں نثار کو ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر نامساعد حالات کا سامنا تھا۔ اگر کوئی عام عورت ہوتی تو مرد کو یہ راہ چھوڑنے پر مجبور کر دیتی مگر اس باحوصلہ عورت نے مردانہ وار تمام حالات کا مقابلہ کیا۔ نہ تو خود اپنے ترقی پسند، عقائد اور اصولوں سے روگردانی کی بلکہ جاں نثار کو بھی اپنے عقائد پر ڈٹے رہنے کی تلقین کرتی رہیں۔ 2 اکتوبر 1947ء کے تحریر کردہ خط کے الفاظ کس طرح صفیہ کی ترقی پسندی اور تانیثی شعور کے غماز ہیں، ملاحظہ کیجیے:

> ”اس وقت تو عقائد اور اصولوں کی مضبوطی کا امتحان ہے۔ اس عقیدہ کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے
> کہ اخیر میں شیطنت کی ہار ہو گی اور انسانیت ہی کا بول بالا ہو گا۔۔۔ رہا ملازمت کا سوال تو وہی
> کہ ”تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں“۔ گھبرانے کی کوئی ایسی بات نہیں۔ پیسوں کی طرف
> سے اتنے ہراساں نہ ہو۔ میں فی الحال کما رہی ہوں۔ بھلی نہیں تو بُری بسر ممکن ہے۔ گزر کرنے
> کو یہ بھی بہت ہے۔“(13)

صفیہ ہر حال میں جاں نثار کی کشاکش میں ایک سچے دوست کی طرح شریک رہیں۔ انہیں پریشانیوں کو اپنے اعصاب پر حاوی نہ کرنے کی تلقین کرتی رہیں اور یقین دلاتی رہیں کہ دونوں مل کر مستقبل کے لیے کوئی خوش گوار راستہ ضرور پیدا کر لیں گے۔ جب علی گڑھ میں آزادی فسادات کی صورت میں پھوٹ پڑی تو صفیہ تنہا پورے عزم واستقلال سے بہادری کے ساتھ وقت گزارتی رہیں۔ کبھی کرفیو کے دوران تنہا سٹیشن سے گھر تک کا راستہ طے کرتی ہیں اور کبھی بیمار بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں کہ جب مرد گھروں میں چھپے بیٹھے ہوں ایک جوان تنہا عورت کا مردانہ وار حالات کے خلاف برسرِپیکار رہنا غیر معمولی جرات مندی اور خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔ صفیہ یہی درس جاں نثار کو بھی دیتی ہیں وہ نہ صرف خود

غیر معمولی خود اعتمادی کی حامل ہیں بلکہ انہوں نے شوہر کی ذات میں بھی وہی اعتماد پیدا کر دیا ہے۔ 12 جنوری 1951ء کے خط میں وہ رقم طراز ہیں:

> "خود پر اعتماد پیدا کرو، مجھ پر اعتماد پیدا کرو اور تمہیں زندگی پر خود بخود اعتماد پیدا ہو جائے گا اور فتح تمہاری ہو گی۔ اختر اپنے کو غم ناک مت کر لیا کرو۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ آؤ مل کر اس سے جو کچھ بھی نچوڑ سکتے ہیں نچوڑ لیں اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے۔" (14)

صفیہ نہایت پُر اعتماد شخصیت کی حامل ہیں اور ان کا یہی اعتماد انہیں مسائل کے خلاف نبرد آزما رکھتا ہے اور وہ اپنے قوتِ بازو کے بل بوتے پر تمام مشکلات اور پریشانیوں پر غالب آنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کے آغاز سے ہی انہیں تنہائی اور پر مشقت زندگی کا سامنا ہے۔ بھوپال میں دو سالہ قیام میں شوہر کی سنگت نصیب ہوتی ہے مگر انقلاب پسندی کی سزا کے طور پر دونوں پھر جدا ہو جاتے ہیں۔ جاں نثار بمبئی جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور صفیہ صحیح معنوں میں خود کو ایک انقلابی عورت ثابت کرتی ہیں، وہ حالات سے ہار نہیں مانتیں اور نہ زندگی کی امنگ ختم ہونے دیتی ہیں۔ وہ عزیز شوہر کو بھی یہی تلقین کرتی ہیں:

> "انقلاب پسندی موت سے رغبت نہیں دلاتی، زندگی کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ آؤ زندہ رہیں ایک روشن مستقبل کی امیدوں میں ساتھی۔" (15)

صفیہ کی حقیقت پسندی اور رجائیت ایسے ہتھیار ہیں جن کی بنا پر وہ آگ کے دریا پار کرنے اور ہر جنگ جیت لینے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ زندگی صرف پھولوں کی سیج نہیں ہے بلکہ اس کی راہیں پُر خار بھی ہیں۔ یہ دھوپ اور چھاؤں کا کھیل ہے، دن اور رات کا امتزاج ہے، خوشی اور غم کا میلہ ہے لیکن کوئی ایک کیفیت سدا رہنے والی نہیں ہے۔ آج جس چہرے پر غم کے تاریک سائے ہیں کل اس پر آسوگی کی دمک بھی ہو گی، مگر اس آسودگی کو حاصل کرنے کے لیے، شکست خوردگی کو شکست دینے کے لیے ہمیں لڑنا ہو گا، حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہو گا۔ 31 اپریل 1951ء کے خط میں صفیہ رقم طراز ہیں:

> " یہ دور عجیب خلفشار کا دور ہے۔ بقول شخصے ہر چہرے پر نا آسودہ خوشیوں اور نامراد امنگوں کی کہانی لکھی ہوئی ہے۔ تم اس نا آسودگی کو اپنی شکست خوردگی کیوں سمجھو؟ آج دنیا کے مسائل ہی اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ ہمیں فی الحال کوئی روشن حل قریب نہیں دکھائی دیتا۔ اور ہم بھی اسی دنیا کا حصّہ ہیں، ہمیں بھی غیر مطمئن اور نا آسودہ رہنا ہے اور اسی طرح پوری بہادری سے جینا ہے، اس لیے کہ ہمارا یقین ہے اور ہمارا ایمان کہ ہم نے اگر یہ Fight برقرار رکھی تو جیت ہماری ہی ہو گی ---۔ گھبرا مت جاؤ دوست! میری طرف سے یہ اعتماد پیدا کرو کہ ہر کڑی گھڑی میں میرے لیے تمہارے ہی دم سے راحت ہے اور تمہاری ہی محبت سے تسکین--- اور تمہاری ہر مشکل کو راحت

میں تبدیل کروں گی اور ہر دشواری کو تمہارے لیے آسان بناؤں گی۔" (16)

حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں صفیہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں اور مایوسی و نا امیدی جیسے الفاظ کا ان کی زندگی میں شائبہ تک نہیں ہے۔ وہ نہ صرف اپنی ہمت جواں رکھتی ہیں بلکہ جاں نثار کو بھی ہر مشکل اور تکلیف دہ گھڑی میں پر امید رہنے کے لیے اکساتی ہیں۔ انہیں مکمل یقین ہے کہ ہر کلفت راحت میں بدلے گی، محنت اور ہمت ایک روز فتح یاب ہو گی، دوریوں اور کٹھنائیوں کے دور ختم ہو جائیں گے اور ایک روشن سحر ان کا استقبال کرے گی: "آؤ حوصلہ نہ کھوئیں، ہمت نہ ہاریں، با امید رہیں اور فتح مند، شکست ہماری ہو ہی نہیں سکتی۔" (17)

اپنی بیماری کے ایام میں بھی وہ حالات سے نا امید نہیں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر تمام صورتِ حال واضح کر چکے ہیں۔ بیماری لاعلاج ہے۔ تکلیف بڑھتی ہی جاتی ہے۔ گنٹھیا اور جلد کے سرطان (Scleroderma) نے چلنے پھرنے اور کام کاج سے بیکار کر دیا ہے مگر علاج کے ساتھ ساتھ کالج کی ملازمت بھی جاری رکھتی ہیں۔ جاں نثار بمبئی میں بے روز گاری کے عالم میں انتہائی کسمپرسی کے دن گزار رہے ہیں۔ ان کو بھی معاشی سہارا دیتی ہیں۔ حالت اتنی خراب ہے کہ ملازمت جاری رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے مگر شوہر اور بچوں کے خیال سے ہمت جوان رکھتی ہیں: "شکست ماننے کو ابھی سے جی نہیں چاہتا، خاص طور پر تمہارے اور تمہارے بچوں کے خیال سے۔" (18)

صفیہ فقط اپنی ذات کے لیے ہی جینا نہیں چاہتیں بلکہ وہ دوسروں کی خاطر جینے کو حاصلِ زندگی سمجھتی ہیں اور دنیا کے غموں سے چھٹکارا پانے کا ذریعہ بھی۔ وہ جاں نثار کو بھی کہتی ہیں کہ جو دوسروں کے لیے جیتا ہے غم اس کے پاس نہیں پھٹکتا ہے۔ یہ الفاظ سچے تانیثی شعور کی حامل، ایک باضمیر اور محبت و خلوص کی پیکر ہستی ہی کہہ سکتی ہے۔

صفیہ کے خطوط کے بعض قارئین کو یہ بھی کہتے سنا کہ وہ ترقی پسند تحریک کی رکن ہونے کے باوجود تانیثیت سے عاری تھیں۔ دلیل کے طور پر وہ لوگ "حرفِ آشنا" اور "زیرِ لب" کے خطوط کی مثال دیتے ہیں کہ جس طرح صفیہ نے بِلک بِلک کر جاں نثار کو خط لکھے، خدائے مجازی کی کنیز بن کر ان کے قدموں میں بکھر بکھر گئیں اور برہ کی آگ میں سلگ سلگ کر خاکستر ہوئیں، یہ ایک فیمینسٹ عورت کا وطیرہ نہیں ہو سکتا۔ گویا کہ ان کے نزدیک فیمینزم کے معیار پر پورا اترنے کے لیے ضروری ہے کہ عورت اپنے حقوق اور آزادی کے حصول کی خاطر مرد، سماج اور اعلیٰ اقدار سے بغاوت کرے اور جارحانہ انداز اختیار کرے۔ شوہر سے محبت، الفت اور وفاداری کا رویہ نہ رکھے اور اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اس پر قدامت پرستی اور روایتی عورت ہونے کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ دراصل ایسی سوچ رکھنے والے اصولِ ارتقا کو فراموش کر دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اعلیٰ روایات ہمیشہ صالح اور جاندار رہتی ہیں۔ وہ کبھی مردہ نہیں ہوتیں بلکہ نئے رنگ و روپ کے ساتھ جدید تہذیب کا حصّہ بن کر اس کی اپنی روایات کا روپ دھار لیتی ہیں۔ پتی بھگتی قدیم ہندوستانی تہذیب کی ایسی ہی لازوال اور شاندار روایت ہے جو جدید کلچر میں نئے روپ اور نئے رنگ کے ساتھ زندہ ہے۔

آج کی پتی ورتا عورت نہ تو سیتا کی طرح "اگنی پریکشا" سے گزرتی ہے اور نہ ہی "ستی" ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے محبت اور وفاداری کا دم بھرتی ہے تو جواب میں ویسی ہی چاہت اور وفاداری کی خواہش رکھتی ہے۔ وہ مرد کی خاطر ہر آزمائش میں سے خندہ پیشانی سے گزر جاتی ہے تو صرف اس لیے کہ اسے مرد کی مکمل اور بھرپور رفاقت حاصل ہوتی ہے۔ صفیہ اختر ایسی ہی نئی عورت کی مکمل تصویر نظر آتی ہیں۔ جاں نثار اختر 3 ستمبر 1954ء کے خط بنام خدیجہ اختر میں رقم طراز ہیں:

> "آج کی عورت کو تم کوئی سستا کردار نہ سمجھو، وہ بلند ہے اور پاکیزہ، کل کی نسبت زیادہ باشعور اور سماج کے لیے زیادہ مفید۔۔۔ وہ اپنی نیکی سے مرد کو نیکی سکھاتی ہے، اپنے سماجی اخلاق سے مرد میں سماجی اخلاق پیدا کرتی ہے، خود زندگی کی جدوجہد میں آج حصّہ لے کر مرد کو زندگی کی جدوجہد کا سبق دیتی ہے۔ اس عورت کی جھلک تم جب "زیرِلب" پڑھو گی تو خود صفیہ کے کردار میں پاؤ گی۔ وہ اگر مجھ سے شدید محبت کرتی تھی۔ پرستش کی حد تک تو اس لیے کہ اسے خود میری محبت حاصل تھی۔ میں جب کبھی بھی اس سے کہتا تھا کہ صفیہ میں تمہیں چاہتا واہتا نہیں ہوں تو ہمیشہ وہ کہا کرتی تھی کہ "اختر تم اپنے منہ سے کبھی اعتراف نہ کرو گے لیکن مجھے معلوم ہے تم مجھے بہت چاہتے ہو، ہاں جس دن میں یہ محسوس کروں گی کہ تم مجھے واقعی نہیں چاہتے اس دن میں تمہارے ساتھ خود بھی نہیں رہوں گی کیونکہ وہ صرف "جسم فروشی" رہ جائے گی جس کے لیے میں کسی قیمت پر تیار نہیں۔۔۔" تم اس کے خطوط کو بہت غور و خوض سے پڑھنا تمہیں نئی عورت کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔" (19)

قدیم ہندوستانی تہذیب کی عورت تو بے زبان اور گونگی تھی۔ وہ مرد سے اندھی، گونگی اور بہری قسم کی محبت کرتی تھی اور زمین میں سما جانے اور آگ میں جل جانے کو محبت کی معراج سمجھتی تھی، اس کی زندگی گھر کی چاردیواری تک محدود تھی۔ وہ سماجی زندگی میں کسی حیثیت کی حامل نہ تھی جب کہ صفیہ اختر تہذیب سے جڑی ہونے کے باوجود اس روایتی عورت سے جداگانہ تشخص کی حامل ہیں۔ وہ ہندوستانی کلچر کی اعلیٰ روایات کی نمائندہ بھی نظر آتی ہیں اور نئے خیالات کی حامل ایک جدت پسند عورت بھی۔ وہ ایک ایسی بیوی، رفیق اور دوست بھی ہیں جو صرف خلوت ہی میں مرد کے بازوؤں کی زینت نہیں بنتیں بلکہ جدوجہدِ حیات میں اس کا بازو بھی بنتی ہیں۔ جو کمزور اور کٹھن لمحات میں اس کی طاقت بن کر ابھرتی ہیں۔ کبھی وہ ایک ماں کی طرح شوہر کی رہبر اور رہنما بن کر انہیں راہ گزرِ حیات کی دشواریوں سے بچاتی ہیں اور کبھی ناصح اور ناقد بن کر ان کی فکرِ حیات کو درست روش پر ڈالتی ہیں۔ کبھی بھائی بن کر معاشی جدوجہد میں اپنے مرد کے بازو میں بازو ڈال کر چلتی ہیں اور کبھی شفیق باپ کی طرح زندگی کے زیر و بم سے آگاہ کرتی ہیں۔ وہ زندگی کی ہر رہ گزر پر جاں نثار کی برابر کی شریک ہیں۔ خدیجہ اختر کے نام 16 ستمبر 1954ء کے خط میں جاں نثار اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

> "میں اسے پرانے قسم کی بیوی تسلیم کرلیتا اگر وہ بغیر میری محبت کے اعتماد کے مجھ کو اسی گرویدگی

اور پرستش کے ساتھ چاہ سکتی۔ میں اسے ایک پرانے انداز کی ماں بھی مان لیتا اگر وہ جادو کو
بھوپال کی آب و ہوا ناموافق ہونے پر بھی اسے وہیں اپنے ساتھ رکھنے پر مصر ہوتی۔ میں اسے
مکمل طور پر ایک پرانی وضع کی عورت بھی سمجھ لیتا اگر اس کے دل میں بغیر محنت کے آسائش کا
خیال ہوتا اور خود اپنی زندگی کو اس بری طرح محنت کشی میں نہ گزار دیتی۔ میری دوست! نیا پن
بھی جب پرانی صالح قدروں کو اپناتا ہے جبھی اصل معنوں میں نیا پن بنتا ہے اور ہمارے احترام
اور دنیا کے احترام کا مستحق ہوتا ہے۔" (20)

دراصل صفیہ اختر روایتی فیمینزم کی قائل نہیں ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، آزادیِ نسواں کی حامی، حقوقِ نسواں کی محافظ، فطری جنسی امتیازات کی قائل، شوہر کی وفادار، مامتا کی تصویر، کیرئر اور خاندان دونوں کو اپنے لیے خوشی کا باعث سمجھنے والی ایک نئے دور کی جدت پسند خاتون ہیں۔ صفیہ اختر حقیقی معنوں میں فیمینسٹ خاتون ہیں تاہم، ان کا تعلق فیمینزم کی پہلی لہر سے نہیں ہے جس نے ریڈیکل فیمینزم کو رواج دیا۔ وہ نہ تو معاشرے سے جنس (Gender) کے تصوّر کو ختم کرنے کے نعرے لگاتی ہیں نہ مرد و زن کے فطری و سماجی مناصب کے امتیازات کو رد کرنے کا تقاضا کرتی ہیں اور نہ ہی وہ عورتوں کے لیے مرد جیسے سلوک کا مطالبہ کرتی ہیں بلکہ وہ چاہتی ہیں کہ مرد و زن کے فطری امتیازات کو پہچانتے اور سمجھتے ہوئے برابری کی سطح پر تمام حقوق دیے جائیں۔ ان کے خطوط میں ہمیں ایسی فیمینسٹ خاتون کی عملی تصویر نظر آتی ہے جو نئے دور کی تانیثیت (New Age Farminisam) کی پیروکار ہے اور جو فیمینزم کی تیسری لہر سے متعلق ہے۔ تاہم یہاں یہ امر دل چسپی سے خالی نہیں ہے کہ فیمینزم کے ان نئے مباحث کا آغاز صفیہ کی وفات کے دو دھائیوں بعد ہوا تھا۔ یوں صفیہ اپنے دور کی ایک ایسی نئی عورت ہیں جو اپنے وقت سے بہت آگے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ حمیدہ سالم، شورشِ دوراں، (نئی دہلی: ادب پبلی کیشنز، 1999)، ص76-77

2۔ حمیدہ سالم، ہم ساتھ تھے، (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، 1999ء)، ص157

3۔ صفیہ اختر، (مکتوب) بنام جاں نثار اختر، محررہ، یکم اکتوبر 1943ء، مشمولہ: حرفِ آشنا، (لاہور: نیا ادارہ، سرکلر روڈ، 1973)، ص 15-16

4۔ ایضاً، محررہ، 12 جنوری 1951، مشمولہ: زیرِ لب، (لاہور: نیا ادارہ، سرکلر روڈ، 1960)، ص183

5۔ ایضاً، محررہ، 19 اکتوبر 1943، ص 18

6۔ ایضاً، ص18

7۔ ایضاً، محررہ، 13 جنوری 1944، ص24

8۔ ایضاً، محررہ، 12 جون 1950 مشمولہ: زیرِ لب، ص 67-68

9۔ ایضاً، محررہ، 21 مئی 1947، مشمولہ: حرفِ آشنا، ص171

10۔ ایضاً، محررہ، 15 فروری 1951، مشمولہ: زیرِ لب، ص 142

11۔ ایضاً، محررہ، 20 جولائی 1950 ص85-86

12۔ ایضاً، محررہ، 27 ستمبر 1947، مشمولہ: حرفِ آشنا، ص 190

13۔ ایضاً، محررہ، 2 اکتوبر 1947، ص191-192

14۔ ایضاً، محررہ، 21 جنوری 1951، مشمولہ: زیرِ لب، ص139

15۔ ایضاً، محررہ، 14 جنوری 1952، ص226

16۔ ایضاً، محررہ، 3 اپریل 1951، ص166-167

17۔ ایضاً، محررہ، 3 اپریل 1951، ص 168

18۔ ایضاً، محررہ، 10 اکتوبر 1951، ص 206

19۔ جاں نثار اختر، مکتوب بنام خدیجہ اختر، محررہ، 3 ستمبر 1954، مشمولہ: خاموش آواز، (کراچی: فرینڈز پبلشرز، س ن)، ص 66-67

20۔ ایضاً، ص 72